<u>حرف آغاز</u>

عرب کا قبائلی نظام اور اسلام کی اصلاحات

——————— سید جلال الدین عمری

قبائلی نظام کے طبقات:

اسلام کے آنے سے پہلے اہلِ عرب قبائلی زندگی گزارتے تھے۔ قبیلہ خاندان سے وجود میں آتا ہے۔ اسے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ خاندان جب وسعت اختیار کرتا ہے تو قبیلہ کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اہلِ عرب کے ہاں اس کا ایک نظام تھا۔ اسے انھوں نے اوپر سے نیچے تک چھ درجات میں تقسیم کر رکھا تھا۔ جنھیں وہ شعب، قبیلہ، عمارہ بطن، فخذ اور فصیلہ سے تعبیر کرتے تھے۔[1]

'شعب' قبائل کے مجموعہ کو کہا جاتا ہے۔ اس کی جمع شعوب ہے۔ شعب کے لفظی معنٰی شاخ دار ہونے کے ہیں۔ شعب وہ ہے جہاں سے قبیلے شاخ در شاخ ہوتے ہیں۔ علامہ قرطبی کہتے ہیں: 'الشعوب رؤوس القبائل' یعنی قبائل کے سرے (جہاں سے قبائل شروع ہوتے ہیں) جیسے ربیعہ، مضر، اوس اور خزرج۔[2]

قبیلہ کے اندر بہت سے خاندان یا 'عمائر' ہوتے ہیں۔ عمارہ بطون پر مشتمل ہوتا ہے۔ بطون جمع ہے بطن کی۔ بطن میں افخاذ ہوتے ہیں۔ اس کا واحد 'فخذ' ہے۔ فخذ کے نیچے فصائل، ہوتے ہیں۔ یہ 'فصیلہ' کی جمع ہے۔

حجاز کے عرب حضرت اسماعیلؑ کی نسل سے تھے۔ اس سے بہت سی شاخیں ہوتی چلی گئیں۔ کئی پشتوں کے بعد خزیمہ بن عامر (مدرکہ) کا خاندان وجود میں آیا۔ خزیمہ کی اولاد میں کنانہ تھا۔ کنانہ کے کئی لڑکے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام نضر تھا اور

---

[1] زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل: ۴/۳۶۵-۳۶۶۔ قرآن مجید میں ان میں سے بعض اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں اور بعض الفاظ لغوی معنٰی میں آئے ہیں۔

[2] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، جلد ۸، جزء ۱۶، ص: ۲۲۴

نضر بن کنانہ کو قریش کہا جاتا ہے۔[۱]

اس تقسیم کو سمجھانے کے لیے علامہ زمخشریؒ کہتے ہیں: خزیمہ 'شعب' اور کنانہ اس کا قبیلہ ہے۔ کنانہ سے قریش 'عمارہ' ہے۔ قریش میں قصی 'بطن' ہیں۔ قصی سے ہاشم 'فخذ'، اور عباس 'فصیلہ'۔[۲]

کلبی نے ان چھ طبقات میں سے پانچ طبقات کا اسی ترتیب سے ذکر کیا ہے، البتہ آخری طبقہ 'فصیلہ' کا ذکر اس کے ہاں نہیں ہے۔[۳]

بعض اہلِ علم نے 'فصیلہ' کے بعد 'عشیرہ' کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ اس سے مراد خاندان کے قریب ترین افراد ہیں۔[۴]

امام رازیؒ شعب کی جگہ 'قبیلہ' کو اساس قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کے تحت شعوب، بطون، افخاذ، فصائل اور اقارب آتے ہیں۔[۵]

اس تفصیل سے اتنی بات واضح ہے کہ عرب کا قبائلی نظام مختلف درجات میں تقسیم تو تھا، لیکن ان میں کیا ترتیب تھی اور اس کے لیے کیا اصطلاحات استعمال کی جاتی تھیں، اس میں کسی قدر اختلاف ہے۔

معاہدہ کے ذریعہ خاندان میں شمولیت:

خاندان کا تعلق اصلاً خونی رشتہ اور حسب ونسب ہے۔ لیکن بعض اوقات کوئی نوجوان اپنی شکل وصورت اور وجاہت کی وجہ سے کسی کو پسند آجاتا تو اسے وہ اپنا لیتا اور

۱۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ، دار المعارف، بیروت ۱۹۸۳ء، ۱/۸۳-۸۴ وما بعد

۲۔ زمخشری، الکشاف: ۴/۳۶۲۔ بیضاوی نے اپنی تفسیر میں یہی تفصیل پیش کی ہے۔ معالم التنزیل واسرار التاویل: ۲/۴۱۸۔

۳۔ الشعب اکبر من القبیلۃ، ثم القبیلۃ، ثم العمارۃ، ثم البطن، ثم الفخذ۔ ابن منظور، لسان العرب، دار صادر بیروت ۱۹۹۴ء، مادہ قبل ۱۱/۵۴۱۔

۴۔ ابن کثیر کہتے ہیں: قال علماء النسب یقال شعوب، ثم قبائل، ثم عمائر، ثم بطون، ثم افخاذ، ثم فصائل، ثم عشائر، والعشیرۃ اقرب الناس الی الرجل ولیس بعدہ شیئ۔ السیرۃ النبویۃ: ۱/۶

۵۔ رازی، التفسیر الکبیر، دار الکتب العلمیۃ، لبنان ۱۹۹۰ء، جلد ۱۴، جزء ۲۸، ص ۱۱۸۔

وہ اسی کی طرف منسوب ہونے لگتا۔ [1]

اس مقصد سے ان میں معاہدہ بھی ہوتا جس کی رؤ سے وہ ایک دوسرے کی مدد کے پابند اور ایک دوسرے کے وارث قرار پاتے اور انھیں وہی حقوق حاصل ہوتے جو آدمی کے قریب ترین افراد کو حاصل ہوتے ہیں۔

قتادہؒ کہتے ہیں۔

کان الرجل فی الجاهلية يعاقد الرجل فيقول دمی دمک وهدمی هدمک وترثني وأرثک و تطلب بی و اطلب بک. [2]

زمانۂ جاہلیت میں ایک شخص دوسرے شخص سے معاہدہ کرتا اور کہتا کہ میرا خون تمہارا خون ہے (کوئی مجھے قتل کردے تو تم قصاص یا دیت کا اسی طرح مطالبہ کر سکتے ہو جس طرح اپنے کسی عزیز کے خون کے مطالبہ کا تمہیں حق ہے) جس نے میری عزت پر حملہ کیا گویا اس نے تمہاری عزت پر حملہ کیا (یا جس قاتل کو میں نے معاف کیا تم نے بھی اسے معاف کیا) تم میرے وارث ہوگے اور میں تمہارا وارث ہوں گا۔ مجھ پر زیادتی ہو تو اس کے بدلہ کا تم مطالبہ کروگے اور تم پر زیادتی ہو تو میں اس کے بدلہ کا مطالبہ کروں گا۔

تفسیر کی کتابوں میں اس معاہدہ کا ذکر کسی قدر تفصیل سے ملتا ہے۔ [3]

---

[1] قرطبی کہتے ہیں: کان الرجل في الجاهلية اذا اعجبه من الرجل جلد وظرفه ضمه الى نفسه وجعل له نصيب الذكر من اولاده من ميراثه وكان ينسب اليه فيقال فلان بن فلان. قرطبی، الجامع لاحكام القرآن، جلد ۷، جزء ۱۴، ص ۸۰ (زمانۂ جاہلیت میں جب کسی کو کسی کی قوت و توانائی اور سوجھ بوجھ پسند آجاتی تو اسے وہ اپنا لیتا اور وراثت میں اس کا حصہ اپنی نرینہ اولاد کے برابر قرار دے دیتا۔ اس کے بعد اس کی طرف اس کی نسبت ہوجاتی اور کہا جانے لگتا کہ فلاں شخص فلاں کی اولاد ہے)

[2] ابن جریر، جامع البیان عن تاویل آی القرآن۔ تحقیق محمود محمد شاکر، دار المعارف مصر ۱۹۷۱ء، ۲۷۵/۸۔ یہی بات عکرمہ نے ان الفاظ میں کہی ہے: کان الرجل يقول للرجل ترثني وأرثک، وتنصرني وأنصرک، وتعقل عني وأعقل عنک، ص ۳۴

[3] ملاحظہ ہو۔ بغوی، معالم التنزیل، نیز خازن، لباب التاویل، دار الکتب العلمیۃ، لبنان ۱۹۹۵ء، ۵۹/۲

زمخشریؒ کہتے ہیں:

كـان الـرجـل يـعـاقـد الرجل فيقول دمـي دمـك وهـدمـي هـدمـك وثـأري ثـأرك ، وحـربي حربـك، وسـلمي سلمـك وترثني وأرثـك، وتـطـلـب بـي واطـلـب بـك وتعقل عني واعقل عنك.[۱]

ایک آدمی دوسرے آدمی سے معاہدہ کرتا تو کہتا کہ میرا خون تمہارا خون ہے، میرے خون کا رائیگاں جانا تمہارے خون کا رائیگاں جانا ہے۔ میرے خون کا بدلہ لینا یا انتقام لینا تمہارا بدلہ یا انتقام لینا ہے۔ میری جنگ تمہاری جنگ اور میری صلح تمہاری صلح ہے۔ تم میرے وارث ہوگے اور میں تمہارا وارث ہوں گا۔ مجھ پر زیادتی ہو تو تم میرے بدلہ کا مطالبہ کروگے اور تم پر زیادتی ہو تو میں تمہارے بدلہ کا مطالبہ کروں گا۔ تم میری طرف سے دیت ادا کروگے اور میں تمہاری طرف سے دیت ادا کروں گا۔

قبیلہ کا حلیف:

کبھی یہ بھی ہوتا کہ ایک شخص کسی قبیلہ میں پہنچ جاتا، اسے وہ اپنا حلیف بنا لیتے کہ وہ ان ہی کا ایک فرد ہے۔ اس کے ساتھ حسن سلوک اور ہمدردی کا رویہ اختیار کیا جاتا، لیکن اس میں بعض اوقات زیادتیاں بھی ہوتی تھیں۔ اپنا حق ہوتا یا کسی سے جنگ کرنی ہوتی تو اس سے فائدہ اٹھاتے، لیکن اگر اس کے حق کی بات ہوتی تو نظر انداز کرنے لگتے۔[۲]

عرب میں متبنّٰی بنانے کا رواج تھا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ ایک شخص کسی

۱۔ زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل: ۴۹۴/۱۔ یہی الفاظ السیرۃ الحلبیۃ، ۴۴۰/۱ میں بھی ملتے ہیں۔ اس طرح کے حلیف کا وراثت میں کتنا حصہ ہوتا ہے اس سلسلے میں مختلف اقوال ملتے ہیں۔ بعض روایات سے صرف اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا حصہ لڑکے کے حصہ کے برابر ہوتا تھا۔ ایک دوسرا قول ہے کہ وہ چھٹے حصہ کا حق دار سمجھا جاتا تھا۔ اس موضوع پر راقم نے اپنے ایک غیر مطبوعہ مضمون میں تفصیل سے بحث کی ہے۔

۲۔ طبری، جامع البیان: ۲۸۰/۸

(نوجوان) کو اپنا بیٹا قرار دے کر اس کا اعلان کر دیتا۔ اب دونوں کا تعلق باپ بیٹا کا ہوجاتا۔ وہ اسی کی طرف منسوب ہوتا۔ اس کی بیوی متبنّیٰ کی ماں ہوتی۔ اس کی اولاد اس کے بھائی بہن ہوتے۔ ان کے درمیان اس کا خلا ملا اسی طرح ہوتا جس طرح اولاد کا ہوتا۔ وہ ایک دوسرے کے وارث بھی ہوتے۔

حضرت زید بن حارثہؓ کا واقعہ مشہور ہے۔ زید بن حارثہ کی والدہ سعدیٰ بنت ثعلبہ اپنے قبیلہ بنو معن گئیں۔ ساتھ میں کم سن زید بن حارثہ کو لے گئیں۔ اس دوران میں بنو القین کے لوگوں نے اس قبیلہ پر حملہ کر دیا۔ اسی میں حضرت زید کو بھی لے گئے اور بازار عکاظ میں غلام کی حیثیت سے فروخت کر دیا۔ حکیم بن حزام نے انھیں خرید کر اپنی پھوپھی حضرت خدیجہؓ کو دے دیا۔ حضرت خدیجہؓ نے انھیں رسول اللہ ﷺ کو ہبہ فرمادیا۔ یہ آپ کی خدمت میں تھے کہ ان کے والد اور چچا انھیں لینے کے لیے آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ وہ چاہیں تو ان کے ساتھ جاسکتے ہیں اور چاہیں تو آپ کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ حضرت زید نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔ اس کے بعد آپ نے انھیں آزاد کر کے متبنّیٰ بنالیا۔ حرم میں لے گئے اور لوگوں کے درمیان اعلان کیا اشھدوا ھذا ابنی یرثنی وارثه (گواہ رہو کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ یہ میرا وارث ہوگا اور میں اس کا وارث ہوں گا) اس کے بعد سے آپ کو زید بن محمد کہا جانے لگا۔[1]

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں۔

ماکنّا ندعو زید بن حارثة الا زید بن محمد.[2]	ہم زید بن حارثہ کو زید بن محمد (ﷺ) ہی کہا کرتے تھے۔

علامہ قرطبیؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا یہ قول دلیل ہے اس بات کی کہ:

---

[1] ابن عبدالبر، الاستیعاب فی اسماء الاصحاب: ۲/۱۱۴-۱۱۸۔ ابن اثیر، اسد الغابہ: ۲/۳۵۱-۳۵۳

[2] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ الاحزاب، باب ادعوھم لآبائھم، صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابۃ، باب فضائل زید بن حارثۃ الخ۔

ان التبنّی کان معمولا بہ فی الجاھلیۃ والاسلام یتوارث بہ ویتناصر الی ان نسخ اللہ ذٰلک۔[۱]

دور جاہلیت اور اسلام میں متبنّٰی بنانا معمول بہ تھا۔ اس کی بنیاد پر لوگ ایک دوسرے کے وارث ہوتے اور باہم نصرت وحمایت ہوتی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسے منسوخ قرار دے دیا۔

خاندان کی عصبیت:

خاندان میں دوٗر کے رشتوں کے مقابلہ میں قریب کے رشتوں کو زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ نیچے کی سطح پر ان میں جو استواری اور استحکام پایا جاتا ہے وہ اوپر کی سطح پر باقی نہیں رہتا۔ دونوں کے درمیان کسی مرحلہ میں تصادم ہو تو آدمی کی ہمدردی قریب کے لوگوں سے ہوتی ہے۔ اہلِ عرب میں شدید خاندانی اور قبائلی تعصب تھا۔ اس میں قریب کے رشتے کو دوٗر کے رشتوں پر ترجیح حاصل تھی۔ خاندان اور قبیلہ کا مقابلہ ہو تو خاندان کا ساتھ دیا جاتا۔ خاندان کی حمایت کے جذبے نے تعصب کی شکل اختیار کر لی تھی۔ حق وصداقت اور عدل وانصاف کی جگہ خونی رشتوں کو اہمیت حاصل تھی۔ قریب کے افراد کی نصرت وحمایت کو ہر حال میں فرض سمجھا جاتا۔ ایک عربی شاعر کہتا ہے۔

لا یسألون اخاھم حین یندبھم　　　فی النائبات علی ماقال برھانا

(مشکلات میں جب ان کا بھائی انھیں آواز دیتا ہے تو اس سے اس کے پکارنے کی وجہ نہیں پوچھتے)

دور جاہلیت کا مشہور شاعر طرفہ اپنے چچا زاد بھائی سے خطاب کر کے کہتا ہے:

قرّبتُ بالقُربیٰ وجَدِّک اننی　　　متی یک أمرٌ للنلیثۃ أشھد

(میں نے دوستی کا حق ادا کیا ہے، قسم ہے تیری تقدیر کی جب کوئی پر خطر معاملہ درپیش ہوگا میں ضرور حاضر رہوں گا)

وان اُدع للجُلّٰی أکن من حماتھا　　　وان یأتک الأعداء بالجھد اجھد

(اور اگر کسی بڑی مصیبت کے وقت مجھے آواز دی گئی تو میں تیری عزت کے

---

[۱] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، جلد ۷، جزء ۱۴، ص ۸۰

حامیوں میں رہوں گا اور اگر دشمن تیرے مقابلہ پر اتر آئیں تو میں تیری مدافعت کروں گا۔)

وان یقذفوا بالقذع عِرضَک اسُقِهم　　بکأس حیاض الموت قبل التھدّد

(اور اگر انھوں نے تیری عزت پر حملہ کیا تو میں ان کے دھمکی دینے سے قبل ہی انھیں موت کا پیالہ پلا دوں گا۔)

قبائل کی جنگیں:

قبائل عرب کی اصل ایک تھی، لیکن اس کے باوجود ان کے درمیان جنگ و جدال اور خون ریزی ہوتی رہتی تھی۔ بعض اوقات بہت معمولی باتوں پر تلواریں نکل آتیں اور خون خرابہ کی نوبت آجاتی۔ ان کی ان جنگوں میں فجار کے نام سے چار جنگیں مشہور ہیں:

فجار اول: عکاظ کے میلہ میں بدر بن معشر الغفاری کی خاص مجلس ہوتی تھی۔ وہاں وہ اپنی اونچی حیثیت کا اعلان کرتا اور فخر و غرور کا اظہار کرتا۔ ایک روز پیر پھیلا کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ میں عرب کا سب سے معزز فرد ہوں۔ جو کوئی یہ سمجھتا ہے کہ وہ مجھ سے بھی زیادہ باعزت ہے وہ اس پیر پر تلوار مار دے۔ ایک شخص اٹھا اور تلوار چلا دی اور پیر کو زخمی کر دیا۔ اس پر دونوں قبیلے لڑ پڑے۔

فجار ثانی: بنو عامر کی ایک عورت بازار عکاظ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ قریش کے ایک نوجوان نے اس کے گرد چکر لگانا شروع کر دیا اور اس سے چہرہ کھولنے کے لیے کہا۔ اس نے انکار کر دیا۔ (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں شریف عورتیں پردہ کیا کرتی تھیں) یہ نوجوان خاموشی سے پیچھے بیٹھ گیا اور اس کے تہہ بند میں ایک کانٹا اس طرح لگا دیا کہ جب وہ اٹھی تو اس کا پچھلا حصہ کھل گیا۔ اس پر سب لوگ ہنس پڑے۔ عورت نے آل عامر کو آواز دی۔ وہ ہتھیار لے کر آگے بڑھے۔ ادھر اس نوجوان نے بنو کنانہ کو آواز دی۔ وہ بھی آگئے اور میدان کارزار گرم ہو گیا۔

فجار ثالث: بنو عامر کے ایک شخص نے بنو کنانہ کے ایک شخص کو قرض دیا تھا۔ وہ اس کی ادائی میں ٹال مٹول کرنے لگا تو دونوں قبیلے لڑ پڑے۔ کہا جاتا ہے کہ عبد اللہ

بن جدعان نے اپنی طرف سے قرض ادا کیا تو یہ جنگ ختم ہوئی۔

فجارِ رابع: نعمان بن منذر ٗملک حیرہٗ اپنا تجارتی قافلہ، جس میں اونٹوں پر کپڑے اور خوش بو کا سامان ہوتا، بازار عکاظ بھیجتا، تا کہ یہ چیزیں یہاں فروخت ہوں اور ان کی قیمت سے طائف کی دباغت شدہ کھالیں خریدی جائیں۔ قافلہ کو وہ کسی عرب سردار کی ذمہ داری پر بھیجتا، تا کہ اس کی حفاظت ہو سکے۔ ایک مرتبہ اس نے اس مقصد سے قافلہ بھیجنے کی تیاری کی تو اس کے پاس عرب کے کچھ افراد موجود تھے۔ ان میں بنوکنانہ کا براض اور ہوازن کا عروۃ الرّحال بھی شامل تھے۔ براض نے کہا کہ میں بنوکنانہ کی ذمہ داری لیتا ہوں کہ وہ اس سے تعرض نہیں کریں گے۔ نعمان بن منذر نے کہا: میں تو ایسا شخص چاہتا ہوں جو پورے اہل نجد وتہامہ کی طرف سے پناہ دے سکے۔ اس پر عروۃ الرحّال نے کہا کہ میں یہ پناہ فراہم کر سکتا ہوں۔ براض نے کہا کہ کیا تم کنانہ کے مقابلہ میں بھی پناہ دو گے؟ عروہ نے کہا: ہاں! کنانہ کیا اہل شیخ وقیصوم (عرب کی ساری آبادی) کے مقابلہ میں پناہ دے رہا ہوں۔ اس پر براض سے اس کی تکرار اور تو تو میں میں ہونے لگی۔ عروہ جب سفر سے واپس ہوا تو براض بھی اس کے پیچھے اس کے قتل کے ارادے سے نکل پڑا۔ ایک جگہ عروہ نے قیام کیا اور دادِعیش دینے لگا۔ اسے شراب میں مست پا کر براض نے اسے قتل کر دیا۔ اس کی اطلاع ایک شخص نے کنانہ کو اس وقت دی جب وہ عکاظ میں ہوازن کے ساتھ تھے۔ کنانہ وہاں سے نکل پڑے، تا کہ حدودِ حرم میں پہنچ جائیں، لیکن ہوازن کو بھی یہ خبر مل گئی تو انھوں نے کنانہ کا تعاقب کیا اور حرم میں پہنچنے سے پہلے ہی اسے جالیا۔ دونوں قبائل کے درمیان چھ روز تک کشت و خون کا بازار گرم رہا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو طالب کنانہ کی طرف سے جنگ میں شریک تھے۔ رسول اللہ ﷺ کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ اس وقت آپ کی عمر چودہ پندرہ سال تھی۔ ابن سعد کی روایت ہے کہ آپ بیس سال کی عمر کو پہنچ چکے تھے۔ جنگ میں جو تیر دشمن کی طرف سے آتے اور زمین پر گر جاتے آپ انھیں اٹھا کر اپنے قبیلہ کے جنگ بازوں کو دیتے۔ بالآخر یہ جنگ عتبہ بن ربیعہ کی دعوت صلح پر ختم ہوئی۔ اس میں

قبیلہ قیس کے زیادہ آدمی مارے گئے تھے۔ قریش نے زائد مقتولوں کی دیت ادا کی۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے دیت نہیں لی۔[۱]

حلیف قبائل:

قبائل کے درمیان اقتدار کے لیے کشمکش اور طاقت آزمائی بھی ہوتی رہتی تھی۔ اس کے لیے بعض قبائل مل کر ایک گروہ بن جاتے۔ ان کے مقابلہ میں دوسرے قبائل کا گروپ وجود میں آجاتا اور وہ ایک دوسرے کے تعاون کا فیصلہ کرتے۔ اسے حلیف کہا جاتا۔

'حلف' کے معنی قسم کے ہیں۔ دو فریقوں کا اس بات پر عہد کہ ان کے درمیان اتحاد و اتفاق ہوگا اور وہ ہر حال میں ایک دوسرے کی نصرت و حمایت کریں گے، اسے بھی حلف کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس عہد و پیمان پر قسم کھائی جاتی تھی۔ معاہدہ کرنے والا ہر فریق دوسرے کا حلیف کہلاتا۔ دور جاہلیت میں خزاعہ نے بنو اسد کو حرم سے نکال باہر کیا تو اس نے قبیلۂ طے سے دوستی اور تعاون کا عہد کیا۔ اس لیے بنو اسد اور طے کو 'حلیفان' (ایک دوسرے کے حلیف) کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد بنو اسد نے بنو فزارہ سے اسی طرح کا عہد کیا تو ان دونوں کو بھی 'حلیفان' کہا جانے لگا۔[۲]

قصی بن کلاب نے صحیح معنی میں قریش کو متحد کیا۔ خزاعہ اور بنو بکر وغیرہ قبائل کو مکہ کے اطراف سے نکال باہر کیا اور قریش کو حرم کے چاروں طرف آباد کیا۔ اپنے کارناموں کی وجہ سے وہ بلا شرکت غیرے قریش کے سردار تھے۔ ان کی قیادت کو چیلنج کرنے والا کوئی نہ تھا۔ مکہ پر ان ہی کی حکم رانی تھی۔ ان کے پاس 'حجابۂ'، 'سقایۂ'، 'رفادہ'، 'ندوہ'، اور 'لواءٗ' کے مناصب تھے۔[۳]

---

[۱] ابن سعد (طبقات: ۱/۱۲۶-۱۲۸) اور ابن ہشام (السیرۃ النبویۃ: ۱/۲۲۱-۲۲۴) وغیرہ نے صرف اسی حرب فجار کا ذکر کیا ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کی شرکت ہوئی تھی۔ سہیلی اور مسعودی وغیرہ نے ان چاروں کا تذکرہ کیا ہے۔ اس وقت پیش نظر برہان الدین حلبی کی السیرۃ الحلبیۃ: ۱/۱۲۶-۱۲۸ ہے۔ اس میں ان چاروں لڑائیوں کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔

[۲] فیروز آبادی القاموس المحیط، مادہ حلف، ابن منظور، لسان العرب، مادہ حلف

[۳] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۱۶۱۔ 'حجابۂ' کے معنی ہیں بیت اللہ کی چابیوں پر قبضہ کا ہونا جس کا (بقیہ اگلے صفحہ پر)

قصی بن کلاب کے چار بیٹے تھے: عبد الدار، عبد مناف، عبد العزیٰ اور عبد (باپ کے نام پر اس کا نام بھی قصی تھا) دو بیٹیاں تَخمر اور بَرّہ تھیں۔ قصی کی حیات ہی میں ان کے بیٹے عبد مناف نے کافی ترقی کی تھی اور لوگوں میں ان کا احترام پایا جاتا تھا۔ عبد العزی اور عبد (قصی بن قصی) کا بھی یہی حال تھا۔ قصی کے بڑے بیٹے عبد الدار کی یہ حیثیت نہیں تھی۔ قصی نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں عبد الدار سے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ تمھیں بھی تمہارے بھائیوں کا سا مقام حاصل ہو۔ چناں چہ قصی نے اپنے تمام مناصب عبد الدار کے حوالے کر دیے۔ قصی کے فیصلے سے اختلاف کی کسی میں ہمت نہیں تھی۔ سب ہی بھائیوں نے اسے تسلیم کر لیا اور اس پر عمل جاری رہا۔ لیکن بھائیوں کے بعد عبد مناف کی اولاد نے کہا کہ قوم کے اندر ہمیں جو مقام اور حیثیت حاصل ہے اس لحاظ سے ان مناصب کے ہم زیادہ مستحق ہیں۔ عبد الدار کی اولاد نے کہا کہ یہ مناصب لازماً ہمارے پاس ہوں گے۔ قصی کے فیصلہ کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ بعض قبائل نے بنو عبد مناف کا ساتھ دیا اور بعض نے بنو عبد الدار کا۔ بعض قبائل نے اس تنازعہ سے الگ رہنا پسند کیا۔

بنو عبد مناف نے ایک بڑے برتن میں خوش بو بھری اور کعبہ کے پاس رکھ دیا۔ وہ اور ان کے حلیف اس میں ہاتھ ڈال کر آپس میں تعاون اور ایک دوسرے کا ساتھ دینے اور کبھی ساتھ نہ چھوڑنے کا عہد کرتے اور کعبہ پر اپنا ہاتھ پھیرتے۔ یہ عہد کو پختہ کرنے کی صورت تھی۔ ان قبائل کو 'مطیّبین' کہا گیا، یعنی جنھوں نے خوش بو کا استعمال

(بقیہ صفحہ گذشتہ) اس پر قبضہ ہوتا وہ جس کے لیے چاہے کعبہ کا دروازہ کھولتا اور جس کے لیے بند کرنا چاہتا بند کر دیتا۔ 'سقایہ' یعنی زمزم کا پانی پلانا۔ حاجیوں کی خدمت بہت بڑی سعادت سمجھی جاتی تھی، چنانچہ حج کے ایام میں زمزم خالص شکل میں یا اس میں شہد، دودھ یا نبیذ ملا کر حاجیوں کو پلانا ایک اہم دینی منصب تھا۔ 'رفادہ' یعنی مہمان نوازی۔ حج کے زمانہ میں حاجیوں کے کھانے کا نظم کرنا بھی ایک دینی ذمہ داری سمجھی جاتی تھی۔ اس کے لیے قریش اپنے اموال سے ایک متعین مقدار قصی کے پاس جمع کرتے تھے۔ یہ سلسلہ بعد میں بھی جاری رہا۔ 'ندوہ' سے مراد رائے اور مشورہ کے لیے جمع ہونا۔ قصی نے دار الندوہ قائم کیا تھا۔ تمام اہم امور وہیں طے ہوتے تھے۔ 'لواء' علم یا جھنڈے کو کہا جاتا ہے۔ جنگ میں علم بردار وہی ہوتا جسے سردار منتخب کرتا۔ یہ تمام مناصب قصی کو حاصل تھے۔

کیا۔ دوسری طرف بنوعبد الدار اور ان کے حلیفوں نے بھی کعبہ کے پاس عہد کیا کہ وہ ہر حال میں ایک دوسرے کا تعاون کریں گے اور حلیفوں کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ انھیں 'احلاف' کہا جانے لگا۔

دونوں فریقوں نے جنگ کی تیاری شروع کر دی، لیکن جلد ہی انھیں احساس ہوا کہ وہ آپس ہی میں ایک دوسرے کو ختم کر دیں گے۔ اس پر ان کے درمیان صلح ہوگئی کہ بنوعبد مناف کو سقایہ اور افادہ کے مناصب حاصل ہوں گے اور بنوعبد الدار حسب سابق حجابہ، ندوہ اور لواء کے مناصب اپنے پاس رکھیں گے۔[1]

سیرت کا یہ ایک اہم اور نمایاں واقعہ ہے کہ اہلِ مکہ نے جب دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کو حبشہ میں پناہ مل رہی ہے، حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ جیسے باہمت اور حوصلہ مند افراد آپ پر ایمان لے آئے اور آپ کا ساتھ دے رہے ہیں (اور آپ کے چچا ابو طالب آپ کی حمایت سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں) تو قریش کے قبائل بنو ہاشم اور بنو مطلب کے خلاف باقاعدہ محاذ آرا ہوگئے اور ان کے سماجی مقاطعہ کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد سے ایک تحریر تیار کی کہ بنو ہاشم اور بنو مطلب سے شادی بیاہ اور خرید و فروخت کا تعلق نہیں رکھا جائے گا اور ان سے میل جول اور سماجی تعلقات ختم کردیے جائیں گے۔ اس تحریر کو کعبہ کے وسط میں لٹکا دیا گیا، تاکہ اس کا احترام ہو اور اس کی پوری پابندی کی جائے۔[2]

یہ مقاطعہ دو تین سال جاری رہا۔ بعد میں ان ہی میں سے بعض افراد کی کوشش سے یہ غلط اور مبنی بر ظلم معاہدہ ختم ہوا۔[3]

حلف الفضول:

کبھی اعلیٰ مقاصد کے لیے بھی قبائل اور ان کی مختلف شاخوں کے درمیان

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۱۵۹-۱۶۹۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/۶۶-۷۳۔ طبری، تاریخ الامم والملوک: ۱/۵۰۵-۵۰۹۔ دار الکتب العلمیۃ لبنان ۱۹۹۷ء۔ نیز ملاحظہ ہو۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۱/۹۴-۱۰۲

[2] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۳۸۸

[3] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۴۰۲۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/۲۰۸-۲۱۰

معاہدہ ہوجاتا۔ اس کی بہترین مثال حلف الفضول ہے۔

حرب فجار کے چار ماہ بعد، زبیر بن عبدالمطلب کی تحریک پر بنو ہاشم، بنو عبدالمطلب بنو زہرہ بن کلاب، بنو اسد بن عبد العزیٰ اور بنو تمیم بن مرہ، عبداللہ بن جدعان کے مکان پر جمع ہوئے اور قسم کھا کر عہد کیا کہ ظالم کوئی بھی ہو وہ سب اس کے خلاف ہوں گے اور ایک ہوکر مظلوم کا ساتھ دیں گے، چاہے وہ مکہ کا ہو یا مکہ سے باہر کا، یہاں تک کہ اس کا حق اسے مل جائے۔ اس پر ہم سب عمل کرتے رہیں گے جب تک سمندر اپنے جھاگ کو تر رکھے اور ثبیر اور حراء کی پہاڑیاں اپنی جگہ جمی رہیں (یعنی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے) اور ہم ایک دوسرے کی مالی مدد اور غم خواری کریں گے۔ رسول اللہ ﷺ اس میں شریک تھے۔ بعثت کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اس پاکیزہ عہد کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔

لقد شهدت في دار عبد الله بن جدعان
حلفا ما احب ان لي به حمر النعم ولو
ادعى به في الاسلام لاجبت [۱]

میں عبد اللہ بن جدعان کے گھر میں ایک ایسے معاہدہ میں موجود تھا کہ اس کے مقابلہ میں سرخ اونٹ بھی میں پسند نہیں کروں گا۔ اگر اسلام میں بھی اس کی دعوت دی جائے تو میں اسے قبول کروں گا۔

اسلام کی اصلاحات:

عرب کے خاندانی اور قبائلی نظام کی یہ ایک بہت ہی مختصر اور اجمالی سی تصویر ہے۔ عرب میں خاندان کا ادارہ ضرور موجود تھا۔ ان کے قبائلی نظام میں بعض خوبیاں بھی نظر آتی ہیں، لیکن اس میں خوبیوں سے زیادہ خامیاں اور خرابیاں در آئی تھیں۔ اسلام کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے قبائلی نظام میں بنیادی تبدیلیاں کیں اور اسے صحیح رخ عطا کیا۔ خاندان کو ایک فطری ادارہ کی حیثیت سے تسلیم کیا اور معاشرہ کی فلاح وترقی کے لیے اس کے بقا کو لازمی قرار دیا، اس کی خرابیوں کو دور کیا اور اسے بہت ہی مستحکم بنیادیں فراہم کیں۔

---

[۱] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۱/۱۶۹-۱۷۱۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۱/۱۲۸-۱۲۹۔ نیز ملاحظہ ہو: ابن کثیر، السیرۃ النبویۃ: ۱/۲۵۷-۲۶۲۔ حلف الفضول کا مختصر سا ذکر راقم کی کتاب 'اسلام میں خدمت خلق کا تصور' میں بھی موجود ہے۔ حلف الفضول پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی کا مقالہ سہ ماہی تحقیقات اسلامی علی گڑھ، اپریل-جون ۲۰۰۲ء

ازدواجی تعلق اور خونی رشتے خاندان کی اساس ہیں:

اسلام نے خاندان کی بنیاد جائز ازدواجی تعلق اور خونی رشتوں پر رکھی۔ اس نے کہا کہ اس کے بغیر کوئی شخص خاندان کا فرد شمار نہیں ہوگا اور اسے خاندان کے حقوق حاصل نہیں ہوں گے۔

مواخات کے حدود:

رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے فوراً بعد مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات قائم کی تھی۔ اس کی بنیاد پر مہاجرین کے ساتھ غیر معمولی ایثار اور حسن سلوک ہی کا رویہ اختیار نہیں کیا گیا، بلکہ انصار کے اموال میں ان کا قانونی حق بھی تسلیم کیا گیا اور وہ ان کے وارث قرار دیے گئے۔ یہ ایک پہلو سے خاندان میں باہر کے افراد کی شمولیت تھی اور اس سے خاندان کے حقوق متاثر ہو رہے تھے، اس لیے اس کی قانونی حیثیت ختم کردی گئی۔ چناں چہ ارشاد ہے:

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ (الانفال:۷۵)

رشتہ دار، اللہ کی کتاب میں ایک دوسرے کی میراث کے (دوسروں کے مقابلہ میں) زیادہ حق دار ہیں۔ بے شک اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

اس کی مزید وضاحت ہوئی:

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِىْ كِتٰبِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُهَاجِرِيْنَ اِلَّآ اَنْ تَفْعَلُوْا اِلٰٓى اَوْلِيَآئِكُمْ مَّعْرُوْفًا كَانَ ذٰلِكَ فِى الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا (الاحزاب:٦)

اور رشتہ دار، اللہ تعالیٰ کے قانون میں، دوسرے ایمان والوں اور مہاجرین سے زیادہ ایک دوسرے سے قریب ہیں۔ ہاں اگر تم اپنے رفیقوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہو (تو اس میں کوئی چیز مانع نہیں ہے) یہ اللہ کی کتاب میں لکھا ہوا ہے۔

متبنّٰی نہیں بنایا جاسکتا:

اسی اصول کے تحت تبنّیت کے رواج کو ختم کیا گیا۔ اس بات کی قانونی طور پر

ممانعت کردی گئی کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے بچہ کو متبنّٰی بنا کر اسے اپنی اولاد کے حقوق عطا کردے۔قرآن نے صاف الفاظ میں کہا:

وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَ كُمْ اَبْنَاءَ كُمْ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِى السَّبِيْلَ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَائِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْا اٰبَاءَ هُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَأْتُمْ بِهٖ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا (الاحزاب:۴-۵)

اللہ نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارے (حقیقی) بیٹے نہیں بنا دیے ہیں۔ یہ تو محض تمہارے منہ سے نکلی ہوئی بات ہے۔ اللہ حق کہتا ہے اور وہی سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔ انھیں ان کے باپوں کی طرف منسوب کر کے پکارو۔ اللہ کے نزدیک یہی صحیح طریقہ ہے۔ اگر تمہیں ان کے باپوں کا علم نہ ہو تو وہ تمہارے دینی بھائی اور رفیق ہیں۔ تم سے (اس معاملہ میں) جو چوک ہوجائے اس پر کوئی گناہ نہیں۔ ہاں جو بات تمہارے دل کے قصد وارادے سے نکلے (اس کی باز پرس ہوگی) اور اللہ غفور رحیم ہے۔

یہ اس امر کی صراحت ہے کہ متبنّٰی کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔ وہ اپنے حقیقی باپ کی طرف منسوب ہوں گے۔ جن کا نسب ہی معلوم نہ ہو وہ دینی بھائی اور موالی ہیں۔ اس کے ساتھ حسن سلوک ہوگا۔ وہ کسی دوسرے فرد کی اولاد نہیں ہیں، اس لیے انھیں اولاد کے حقوق حاصل نہ ہوں گے۔

قریبی رشتوں کا تقدس:

خاندان کا تقدس اور پاکیزگی پامال ہورہی تھی۔ بعض اوقات لوگ سوتیلی ماں سے شادی کر لیتے۔ قرآن نے اسے بڑی بے حیائی اور بے راہ روی قرار دیا:

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَاؤُكُمْ مِنَ النِّسَاءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا وَّسَآءَ سَبِيْلًا (النساء:۲۲)

تمہارے باپ (دادا نانا) نے جن عورتوں سے نکاح کیا ہے ان سے تم نکاح نہ کرو۔ ہاں اس سے پہلے جو ہو چکا وہ ہو چکا۔ بے شک یہ بے حیائی کی حرکت اور (خدا کے) غضب کا کام اور برا طریقہ ہے۔

ایک غلط طریقہ یہ رائج تھا کہ آدمی دو بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کر لیتا۔ یہ بھی ہوتا کہ بیوی کی موجودگی میں اس کی بہن سے نکاح کر لیا جاتا۔ یہ ایک غیر فطری عمل تھا۔ قرآن نے اسے حرام قرار دیا:

وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَاقَدْسَلَفَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْراً رَّحِيْماً (النساء:۲۳)

(اللہ نے حرام کیا ہے) کہ تم دو بہنوں کو نکاح میں جمع کر لو۔ ہاں جو ماضی میں ہو چکا، ہو چکا۔ بے شک اللہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔

اس میں حقیقی، سوتیلی اور رضاعی بہنیں شامل ہیں۔ احادیث میں بیوی کے ساتھ اس کی خالہ یا پھوپھی سے نکاح کو بھی منع کیا گیا ہے۔

قرآن نے ماں، بیٹی، بہن، پھوپھی، خالہ، بھانجی، بھتیجی، رضاعی ماں، رضاعی بہن، بیوی کی ماں (خوش دامن) ربیبہ (بیوی کی وہ لڑکی جو دوسرے شوہر سے ہو) لڑکے کی بیوی (بہو) سے نکاح کو حرام قرار دیا ہے۔ (النساء:۲۳)

اس طرح اسلام نے قریب ترین رشتوں کے احترام کا جذبہ پیدا کیا اور اس احترام کو ختم کرنے کی کسی حال میں اجازت نہیں دی، تاکہ خاندان جنسی جذبات کی آماج گاہ نہ بننے پائے۔

لڑکیاں زندہ درگور نہ ہوں گی:

خاندان میں جو طاقت ور ہوتا وہ کم زور پر ظلم کے تیر چلاتا اور مختلف طریقوں سے ان کے حقوق پامال کرتا۔ خاص طور پر عورتیں اور یتیم اس کا نشانہ بنتے۔

لڑکوں کے مقابلہ میں لڑکیوں کی کوئی حیثیت نہیں تھی، بلکہ انھیں بوجھ سمجھا جاتا۔ بعض اوقات لڑکیاں زندہ درگور کردی جاتیں۔ اسلام نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور اسے ایک ایسا سنگین جرم قرار دیا جس کی باز پرس سے آدمی قیامت کے روز بچ نہیں سکتا:

وَاِذَاالْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ بِاَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ (التکویر:۸-۹)

جب زندہ دفن کی گئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ کس جرم میں اس کی جان لی گئی تھی۔

چار نکاح کی اجازت عدل کی شرط کے ساتھ:

آدمی جتنی عورتوں سے چاہے، شادی کر سکتا تھا۔ اسلام نے بہ یک وقت چار سے زیادہ بیویوں کی اجازت نہیں دی اور شرط یہ رکھی کہ ان کے ساتھ نان نفقہ اور سلوک میں عدل وانصاف اور مساوات ہو۔ اگر اس کا یقین نہ ہو تو کہا گیا کہ ایک ہی نکاح کیا جائے۔

وَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً (النساء:۳) — اگر تمہیں ڈر ہو کہ بیویوں کے ساتھ انصاف نہ کرو گے تو صرف ایک نکاح کرو۔

طلاق کا طریقہ:

طلاق کی کوئی حد نہ تھی۔ آدمی جتنی مرتبہ چاہے اور جتنی مدت کے لیے چاہے طلاق دیتا اور جب جی چاہے، رجوع کر لیتا۔ اسلام نے اس پورے مسئلہ کو ایک خاص رخ سے دیکھا اور ایک نئے ڈھنگ سے حل کیا۔ اس نے کہا کہ عقد نکاح مودت ومحبت کا رشتہ ہے۔ اسے جہاں تک ہو سکے باقی رکھنے کی کوشش ہونی چاہیے، اس لیے کہ اس کا منقطع ہونا پورے خاندانی نظام کو متاثر کر سکتا ہے۔ اختلافات ہوں تو انھیں دوٗر کرنے کی ممکنہ تدابیر، جن کی اس نے خود وضاحت کر دی ہے، اختیار کی جانی چاہئیں۔ اس کے باوجود طلاق دینی ہی پڑے تو صرف دو بار وقفہ وقفہ سے طلاق دی جا سکتی ہے۔ ان میں عدت کے درمیان رجوع کا حق حاصل ہوگا۔ اگر تیسری بار طلاق دی جائے تو رجوع کا حق ختم ہو جائے گا اور اس سے دوبارہ نکاح اسی وقت صحیح ہوگا جب کہ وہ کسی دوسرے مرد کے نکاح میں جائے اور وہ بھی اسے طلاق دے دے (یا اس کی موت واقع ہو جائے) اس کے بعد پہلا شوہر عورت سے دوبارہ نکاح کرنا چاہے اور عورت بھی اس کے لیے آمادہ ہو تو نکاح کر سکتا ہے:

اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاکٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌ بِاِحْسَانٍ...... فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰی تَنْکِحَ — طلاق دو بار ہے (اس میں رجوع ہو سکتا ہے) اس کے بعد یا تو دستور کے مطابق بیوی کو رکھا جائے یا بھلے طریقہ سے اسے چھوڑ دیا جائے

زَوْجاً غَیرَہٗ ......(البقرۃ:۲۲۹-۲۳۰)

...... پھر اگر اس عورت کو (تیسری بار) طلاق دی تو وہ اس کے لیے حلال نہ ہوگی جب تک کہ وہ کسی دوسرے سے نکاح نہ کرے۔

ظہار اور اس کا کفارہ:

عربوں میں 'ظہار' کا طریقہ رائج تھا۔ وہ یہ کہ آدمی بیوی سے کہتا 'انت علی کظھر امی' (تم میرے لیے میری ماں کی پیٹھ کی طرح ہو) اور علیٰحدگی اختیار کرلیتا۔ اسے طلاق سمجھا جاتا تھا۔ قرآن نے کہا کہ یہ ایک لغو اور بے ہودہ بات ہے کہ آدمی بیوی کو ماں قرار دے بیٹھے:

اَلَّذِیْنَ یُظٰھِرُوْنَ مِنْکُمْ مِنْ نِسَائِھِمْ مَاھُنَّ اُمَّھٰتِھِمْ اِنْ اُمَّھٰتُھُمْ اِلَّا الّٰئِیْ وَلَدْنَھُمْ وَاِنَّھُمْ لَیَقُوْلُوْنَ مُنْکَراً مِنَ الْقَوْلِ وَزُوْراً وَّاِنَّ اللّٰہَ لَعَفُوٌّ غَفُوْر (المجادلۃ:۲)

تم میں سے جو لوگ اپنی عورتوں سے ظہار کریں وہ ان کی مائیں نہیں ہوجاتیں۔ ان کی مائیں تو وہ ہیں جنھوں نے انھیں جنم دیا ہے۔ بے شک جو لوگ ظہار کرتے ہیں وہ ایک ناپسندیدہ اور غلط بات کہتے ہیں اور بے شک اللہ بڑا معاف کرنے اور بخشنے والا ہے۔

حکم ہوا کہ اگر کوئی شخص 'ظہار' کی غلط حرکت کر بیٹھے تو بیوی سے ازدواجی تعلق رکھنے سے پہلے لازماً کفارہ ادا کرے۔ کفارہ یہ ہے کہ ایک غلام آزاد کیا جائے، اس کی استطاعت نہ ہو یا اس کی کوئی صورت نہ ہو تو مسلسل ساٹھ روزے رکھے۔ یہ بھی ممکن نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔ (المجادلہ:۳-۴)

ایلاء اور اس کا حکم:

اہلِ عرب میں 'ایلاء' کا بھی دستور تھا۔ 'ایلاء' کے معنی ہیں عورت کو چھوڑ دینے کی قسم کھانا۔ حضرت سعید بن المسیبؒ فرماتے ہیں کہ دورِ جاہلیت میں عورتوں کو تنگ کرنے کا یہ ایک طریقہ تھا۔ آدمی اپنی بیوی کو طلاق دے کر آزاد نہیں کرتا تھا، اس لیے کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی دوسرا اس سے شادی کر لے۔ وہ قسم کھا کر بیوی سے تعلق ختم

کر دیتا۔ وہ شوہر والی ہونے کے باوجود عملاً بے شوہر کے زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اہلِ جاہلیت کا ایلاء سال دو سال، بلکہ اس سے زیادہ عرصہ کے لیے ہوتا۔[۱]

قرآن مجید نے اس ظلم کو ختم کیا اور اس کی مدت چار ماہ متعین کی۔ ارشاد ہے:

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَائِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ فَاِنْ فَآءُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (البقرۃ:۲۲۶-۲۲۷)

وہ لوگ جو اپنی عورتوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھاتے ہیں ان کے لیے چار ماہ کی مہلت ہے۔ اگر وہ اس میں رجوع کرلیں تو اللہ غفور و رحیم ہے۔ لیکن اگر وہ طلاق کا ارادہ ہی کرلیں تو اللہ تعالیٰ سننے اور جاننے والا ہے۔

اس حکم کی رو سے اگر کوئی شخص عورت کو چھوڑ دینے کی قسم کھالے اور چار ماہ کے اندر رجوع کرلے تو اسے قسم کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ لیکن اگر اس نے طلاق ہی کا فیصلہ کرلیا ہے تو اسے طلاق دے دینی چاہیے۔ ورنہ فقہ شافعی کی رو سے حاکم تفریق کرادے گا۔ احناف کے نزدیک چار ماہ کی مدت گزر گئی اور آدمی نے رجوع نہیں کیا تو خود بخود طلاق واقع ہوجائے گی اور رجوع کا حق باقی نہیں رہے گا۔

عورتوں سے حسن سلوک کی ہدایت:

ان ناروا اور ظالمانہ طریقوں کے علاوہ عام زندگی میں عورت کے ساتھ طرح طرح کی زیادتیاں ہوتیں، غیر مہذب اور غیر اخلاقی رویہ اختیار کیا جاتا۔ قرآن نے حسن سلوک اور اعلیٰ اخلاقی رویہ اختیار کرنے اور عورت میں کوئی کم زوری ہو تو بھی اسے درگزر کرنے کا حکم دیا:

وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا (النساء:۱۹)

ان کے ساتھ معروف کے مطابق زندگی گزارو۔ اگر (کسی وجہ سے) تم ان کو ناپسند کرتے ہو تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ نے اس میں بڑی بھلائی رکھی ہو۔

---

[۱] ابن حیان اندلسی، البحر المحیط: ۱۹۱/۲۔ ایلاء پر تفصیلی بحث کے لیے دیکھی جائے ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم ۲۶۸/۱-۲۶۹

وراثت میں عورت کا حق:

دورِ جاہلیت میں عورت وارث نہیں ہوتی تھی۔ وراثت میں اس کا کوئی حق تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ اسلام نے وراثت میں اسے شریک کیا اور اس کا حق متعین کیا:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَکَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِمَّا تَرَکَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيباً مَّفْرُوضاً (النساء:۷)

مردوں کا بھی حصہ ہے اس مال میں جو ماں باپ اور قرابت دار چھوڑ جائیں اور عورتوں کا بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور قرابت دار چھوڑ جائیں، چاہے وہ کم ہو یا زیادہ (ہر ایک کا) حصہ طے شدہ ہے۔

یتیم کا حق نہ مارا جائے:

خاندان میں یتیموں کے ساتھ بڑا ظلم ہوتا۔ خود ان کے اولیاء اور سرپرست ان پر زیادتی کرتے اور ان کے مال اور جائداد پر قبضہ کر لیتے۔ قرآن نے اس پر آخرت کی وعید سنائی اور اس سے باز رہنے کی تاکید کی:

اِنَّ الَّذِيْنَ يَاكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْماً اِنَّمَا يَاكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَاراً وَّسَيَصْلَوْنَ سَعِيْراً (النساء:۱۰)

جو لوگ یتیموں کے مال ناحق کھاتے ہیں وہ حقیقت میں اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں اور جلد ہی جہنم کی دہکتی آگ میں داخل ہوں گے۔

یتیموں کے ساتھ ہمدردی، خیر خواہی اور الفت و محبت کا جو رویہ اختیار کیا جانا چاہیے اور اس کے مال کی جس طرح حفاظت ہونی چاہیے اس کی بھی وضاحت کی۔ (النساء:۶)

صلہ رحمی کی ہدایت:

خونی رشتوں کے احترام اور صلہ رحمی کا حکم دیا:

وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَ لُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْباً (النساء:۱)

اور ڈرتے رہو اس اللہ سے جس کے واسطہ سے تم ایک دوسرے سے اپنے حقوق کا مطالبہ کرتے ہو اور رشتوں کا پاس رکھو۔ بے شک اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اسے دیکھ رہا ہے۔

اللہ کے نیک بندوں کی ایک خاص صفت یہ بتائی گئی کہ جن تعلقات کو جوڑنے کا انھیں حکم دیا گیا ہے انھیں وہ جوڑے رکھتے ہیں۔ اس میں صلہ رحمی سب سے پہلے آتی ہے:

وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ اَنْ یُّوْصَلَ وَیَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَیَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ (الرعد:۲۱)

وہ جو ان تعلقات کو جوڑتے ہیں جن کے جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور (آخرت کے) برے حساب کا خوف رکھتے ہیں۔

آیت میں تعلقات کو جوڑے رکھنے کا ذکر خدا کی خشیت اور آخرت کے خوف کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس سے اہمیت واضح ہوتی ہے۔

قطع رحم کی سختی سے ممانعت کی گئی۔ اسے ایمان کے منافی اور منافقانہ کردار قرار دیا گیا۔ منافقین کے بارے میں ارشاد ہے:

فَهَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ تَوَلَّیْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَکُمْ (محمد:۲۲)

اگر تم دین سے پھر گئے اور کفر کی طرف پلٹ گئے تو بعید نہیں کہ زمین میں فساد پھیلانے اور قطع رحم (آپس میں خون خرابہ) کا ارتکاب کرنے لگو۔

قرابت داروں کے حقوق متعین نہیں تھے۔ قریب کے رشتہ داروں کے قانونی حقوق متعین کیے گئے اور دوُر کے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک، تعاون اور ہمدردی کا حکم دیا گیا۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ احکام وراثت کے ذیل میں ارشاد

ہے کہ حق داروں کا حق ادا کیا جائے اور جن ضرورت مندوں کا قانونی حق نہیں ہے انھیں نظر انداز نہ کیا جائے۔ وہ حسن سلوک کے مستحق ہیں۔ اس میں سب سے پہلے رشتہ دار آتے ہیں:

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُوْلُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسَاكِيْنَ فَارْزُقُوْهُمْ مِنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلاً مَّعْرُوْفاً (النساء:۸)	جب وراثت کی تقسیم کے وقت قرابت دار، یتامی اور مساکین حاضر ہوں تو ان کو اس میں سے کچھ دے دو اور ان سے بھلی بات کہو۔[1]

قبائل کا اتحاد:

قبائلِ عرب ایک دوسرے کے حریف بن گئے تھے۔ ان کے درمیان عداوتیں اور دشمنیاں پرورش پا رہی تھیں۔ معمولی باتوں پر ایک دوسرے کے خلاف تلواریں نکل آتیں اور خون ریزی شروع ہو جاتی۔ اسلام نے ان حریف اور متحارب قبائل میں اخوت ومحبت کے جذبات پیدا کیے اور ان سب کو جوڑ کر ایک ملت بنایا اور وہ اپنے اختلافات اور تعصّبات کو بھول کر باہم شیر وشکر ہو گئے۔ اسی احسان عظیم کا ان الفاظ میں ذکر ہے:

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ اِخْوَاناً وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِنْهَا...... (آل عمران:۱۰۳)	تم اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جب کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اللہ نے تمہارے دلوں کو محبت سے جوڑ دیا اور تم اس کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے اور تم ایک آگ کے گڑھے کے کنارے پہنچ چکے تھے، اللہ نے تمہیں اس سے بچالیا۔

---

[1] اسلام نے عرب کے خاندانی نظام میں جو اصلاحات کیں ان کی طرف یہاں صرف اشارات کیے گئے ہیں۔ ان کی تفصیل کے لیے راقم کی حسب ذیل کتابیں دیکھیں جائیں: عورت۔ اسلامی معاشرہ میں، مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ، اسلام انسانی حقوق کا پاسباں۔

اس کا اطلاق عرب کے سب ہی قبائل پر ہوتا ہے، لیکن اصلاً اس میں مدینہ کے اوس اور خزرج کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ان کے درمیان بار بار جنگ کے شعلے بھڑکتے رہتے تھے۔ جنگ بعاث، جنگ داحس اور جنگ حاطب جیسی جنگیں اس کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ ہجرت سے پہلے حج کے موسم میں رسول اللہ ﷺ جس طرح دوسرے قبائل کے سامنے اسلام کی دعوت پیش فرماتے اسی طرح عقبہ کے مقام پر خزرج کے وفد کو بھی اسلام کی دعوت دی۔ انھوں نے اسے قبول کرتے ہوئے کہا کہ ہماری قوم کے درمیان جو عداوت اور دشمنی ہے وہ کسی دوسری قوم میں نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ آپ کے ذریعہ ہمارے درمیان شاید یہ اتحاد پیدا فرمادے۔ ہم اس کے سامنے آپ کا پیغام رکھیں گے اور جس دین کو ہم نے قبول کیا ہے اسے قبول کرنے کی دعوت دیں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس پر ہم سب کو متحد و متفق کردے تو ہمارے درمیان آپ سے زیادہ محترم و معزز کوئی دوسرا شخص نہ ہوگا۔[1]

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اوس اور خزرج کے قبائل کا کیا حال تھا۔ زمخشری اور بعض دیگر مفسرین نے لکھا ہے کہ اوس وخزرج ایک ماں باپ کی نسل سے تھے، لیکن ان کے درمیان عداوت اور دشمنی کا سلسلہ ایک سو بیس (۱۲۰) برس سے جاری تھا۔ بالآخر اسلام نے اس آگ کو بجھایا اور رسول خدا ﷺ کے ذریعہ ان کے درمیان الفت ومحبت پیدا فرمائی۔[2]

عالم گیر امت وجود میں آگئی:

قبائلی نظام ایک تنگ دائرہ میں محدود تھا۔ وہ اسی دائرہ میں اپنے معاملات و مسائل حل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس سے باہر کی دنیا کو وہ دیکھ نہیں پارہا تھا۔ اسلام نے اسے فکر ونظر کی اس تنگنائے سے نکالا اور اسے انسانیت کا وسیع تصور دیا۔ اس نے

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، دار احیاء التراث الاسلامی، بیروت ۱۹۹۴ء، ۲/۴۲

[2] زمخشری، الکشاف: ۱/۳۸۷

بتایا کہ پوری دنیا کے انسان ملکوں، خطوں، نسلوں، زبانوں اور الگ رنگ وروپ کے اختلاف کے باوجود ایک ہیں، اس لیے کہ ان کی اصل ایک ہے، وہ سب ایک اللہ کے بندے اور ایک ماں باپ کی اولاد ہیں۔ خاندان اور قبیلے محض تعارف کا ذریعہ ہیں ان کی بنیاد پر نوع انسانی کی تقسیم نہیں کی جاسکتی:

يَاۤ أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثٰى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْباً وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (الحجرات:۱۳)

اے لوگو! بے شک ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قوموں اور قبیلوں میں کردیا، تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ بے شک تم میں زیادہ باعزت اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے زیادہ تقوے والا ہو۔ یقیناً اللہ جاننے والا اور باخبر ہے۔

جب سارے انسان ایک ہی ہیں تو ان کی صلاح وفلاح کا راستہ بھی ایک ہی ہوسکتا ہے۔ وہ راستہ ہے خدا کی عبادت واطاعت اور اس کی بندگی کا۔ اس راستہ کی طرف قرآن دعوت دیتا ہے:

يَاۤ أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشاً وَّالسَّمَاءَ بِنَاءً وَّأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقاً لَّكُمْ فَلاَ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ أَنْدَاداً وَّأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (البقرۃ:۲۱-۲۲)

اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا، تاکہ تم تقویٰ کی زندگی گزار سکو۔ (تمہارا رب) جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی برسایا اور اس سے تمہارے کھانے کے لیے پھل پیدا کیے۔ پس کسی کو اللہ کے مد مقابل نہ ٹھہراؤ اگر تم جانتے ہو۔

اس طرح اسلام نے ان قبائل کے درمیان اتحاد واتفاق پیدا کیا جو باہم جنگ و

جدال اور کشت وخون میں گرفتار تھے۔ ان کے اختلاف وانتشار کو رفع کر کے انھیں ایک وحدت میں تبدیل کیا اور ایک امت بنایا۔ جو قبائل بہت ہی محدود دائرہ میں سوچنے اور صرف اپنے مفاد کو دیکھنے کے عادی تھے انھیں ایک آفاقی اور عالمی نقطۂ نظر عطا کیا اور انھیں ساری دنیا کے امام اور رہنما کی حیثیت سے کھڑا کیا۔ اس کے نتیجہ میں وہ صالح انقلاب برپا ہوا جس کی مثال تاریخ کے صفحات میں تلاش کرنے سے بھی نہیں ملتی۔

غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق

مولانا سید جلال الدین عمری

ہندوستان کے پس منظر میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کیسے تعلقات ہونے چاہئیں ؛ یہ موضوع کافی اہمیت اختیار کر گیا ہے، اس لئے کہ فرقہ پرستوں نے اس سلسلہ میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں۔ مثلاً انھوں نے یہ پروپیگنڈا کیا ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کے علاوہ دوسرں کو موجبِ گردن زنی قرار دیتا ہے اور اس میں مذہبی رواداری اور توسّع نہیں پایا جاتا۔ اس کتاب میں غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ سلوک ان کی مذہبی آزادی اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان معاشرتی، معاشی اور سیاسی تعلقات پر اسلامی نقطۂ نظر سے بحث کی گئی ہے۔ فاضل مصنف کے جاندار اور رواں دواں قلم نے سلیس اور دلکش اسلوب میں پیچیدہ مسائل کی گتھی سلجھائی ہے۔

ہندوستان کے پس منظر میں غیر مسلموں سے تعلقات کے موضوع پر اپنی نوعیت کی پہلی مفصل کتاب، دعوت وتبلیغ کے میدان میں کام کرنے والوں کی ایک اہم ضرورت آفسیٹ کی حسین طباعت، عمدہ کاغذ، صفحات: ۳۳۲ قیمت (مجلّد) =/۱۰۰ روپے

ملنے کے پتے

ادارۂ تحقیق وتصنیف اسلامی، پوسٹ بکس نمبر: ۹۳، علی گڑھ۔ ا

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، دعوت نگر ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی۔ ۲۵